Article

The Concept of Love in Tariq Hashmi's Ghazal in the Perspective of Classical Poetry

طارق ہاشمی کی غزل میں تصورِ عشق

(کلاسیکی شاعری کے تناظر میں)

Rizwana Bibi*[1]
PhD Urdu Scholar ,SUIT,Peshawar

[1] رضوانہ بی بی

پی ایچ ڈی اردو سکالر، سرحد یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور۔

Correspondanance: rizwanaphd839@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 21-07-2024
Accepted:20-09-2024
Online:26-09-2024

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Urdu poem seems dominant in the field of Urdu literature almost about a half century back. Far behind the scene during classical period, we see only Urdu ghazal catering a big toll of commendation. After this the literary era was a mash up of Urdu poem and Urdu Ghazal. Poets like Faiz were in well in practice to grow such culture. The contemporary time of Urdu literature is in favor of Urdu poem. In such a time, the revival of Urdu Ghazal is a significant distinct itself. Only few of Urdu poets are indulged in versifying Urdu Ghazal. Tariq Hashmi is amongst them with a distinctive tendency towards Urdu ghazal. His Ghazal consists upon classical elements in which the concept of love is prominent. The present paper is to study the concept of love in Tariq Hashmi's Ghazal under the perspective of Urdu classical poetic modes.

KEYWORDS: Urdu Poem, Classical Period, Urdu Ghazal, Faiz, Tariq Hashmi, Classical Poetic Modes.

گزشتہ دو دہائیوں کے ادبی افق پر نگاہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ادب کی ترویج و ترقی میں ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی معرف بہ طارق ہاشمی کا نام نمایاں ہے۔ تنقید و تحقیق اور نثر نگاری کے ساتھ ساتھ میدانِ سخن میں بھی طارق ہاشمی کی شناخت نمایاں ہے۔ پہلی کتاب "زہراب" ہے جو کم عمری میں ہی موزوں کر ڈالی۔ ۱۹۸۹ء میں طارق ہاشمی کا یہ شعری مجموعہ منظر عام پر آیا تو وہ انٹر میڈیٹ کے طالب علم تھے۔ سخن گوئی کے اوائل دور میں دیپک کا تخلص استعمال کیا جو شاعری کے عمومی رجحان کی جانب مشارہے لیکن جلد ہی اس عمومی رنگ سے چھٹکارہ پالیا۔ دوسرا شعری مجموعہ "دل دسواں سیارہ ہے" پہلے مجموعے کے تیرہ سال بعد ۲۰۰۲ء میں سامنے آیا جس میں نظم اور غزل دونوں موجود ہیں۔ یہ طویل وقفہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ طارق ہاشمی کی شاعری میں مقدار سے زیادہ معیار کی پیروی کی گئی ہے۔ وہ ایسے زود گو شاعر نہیں کہ کلام پہ کلام کیے چلے جائیں اور اس کے حسن پر نگاہ ہی نہ کریں بلکہ ان کے کلام کی خوبی ہی ان کا تفکر ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنی تخلیق کو منظر عام پر لانے میں عجلت کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ اپنی تخلیق کو ناقدانہ کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہی اسے عام کرتے ہیں۔ انہوں نے اطراف و جوانب سے ابھرتے ہوئے بھانت بھانت کے شاعروں کے برخلاف اپنے لیے الگ راہ تراشی اور نظم و غزل ہر دو اصناف سخن میں اپنا انفرادی جوہر برقرار رکھا۔ ان کی شاعری میں جدت اور کلاسیکیت کا انضمام ملتا ہے۔ اوائل عمری سے ہی ادبی ماحول کے پروردہ رہے جس کی وجہ اسے ان کے شعری ذوق کی خوب آبیاری ہوئی۔ مقالہ ہذا میں ان کی غزل میں عشق کے کلاسیکی رنگ کا مطالعہ مقصود ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "دستک، دیا، دل" ۲۰۱۰ء میں سامنے آیا جس میں صرف اور صرف غزلیات ہیں جو ان کے مزاج میں غزل کے رچاؤ کا واضح اشارہ ہے۔ ان کی غزل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے روایت کی پاسداری خوب کی ہے۔ اگرچہ ان کی غزل میں کلاسیک اور جدید رنگوں کی آمیزش ملتی ہے تاہم اس بات سے انکار نہیں کہ ان کے ہاں جدید عہد کا شاعر ہونے کے باوجود کلاسیک کا رنگ بہت گہرا ہے۔ رومانی رنگ کلاسیکی شاعری کی پہچان ہے۔ طارق ہاشمی کی غزل میں یہ رنگ انتہا کا جاذب ہو جاتا ہے جب وہ محبوب کے خیال کو اپنے شعر کی اساس قرار دیتے ہیں اور اس کے عشق کو حاصلِ زیست قرار دیتے ہیں:

تیرا خیال میرے دل سے گر چلا جاتا
تو شعر کہنے کا مجھ سے ہنر چلا جاتا
تمہارا عاشق نہ کرتا جو کشت جاں سیراب
یہ نخل زیست مرا بے ثمر چلا جاتا(۱)

طارق ہاشمی کے ہاں عشق میں سپردگی کا عجب عالم ملتا ہے۔ ان کے ہاں عاشق کا وجود معشوق کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ روح، قلب اور خونِ جگر کا عاشق سے کچھ علاقہ نہیں تاوقتیکہ معشوق اس کی ذات میں حلول نہ ہو جائے۔ گویا یہاں "میں" نہیں بلکہ "تو" کا "میں" ہونا واقع ہے۔ کلاسیکی شاعری میں بھی اس موضوع کو کئی شعرا نے موزوں کیا ہے۔ طارق ہاشمی کے ہاں اس احساس کا اظہار دیکھیے:

کہاں ہے روح کہاں دل کہاں لہو مجھ میں
سرِ وجود کوئی ہے تو صرف تو مجھ میں (۲)

کلاسیکی شاعر شاہ اکبر داناپوری نے اسی خیال کو ان الفاظ کا پیراہن پہنایا ہے:

مری روح تو ہے مری جان تو ہے
مرے مرنے جینے کا سامان تو ہے (۳)

گویا عاشق کی زندگی معشوق سے مشروط ہے۔ شاہ اکبر صوفی منش شاعر تھے۔ اس اعتبار سے ان کے شعر کی معنوی سطح مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کرتی ہے۔ طارق ہاشمی کا متذکرہ بالا شعر بھی اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ روحانی احساس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری میں عشق کا ظاہری جمال بھی جلوہ گر ہے۔ کلاسیکی شاعری میں محبوب کا حسن غزل کا موضوع خاص رہا ہے۔ طارق ہاشمی نے بھی اس موضوع کو خوب برتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو اگرچہ ان کا عشق زمینی معلوم ہوتا ہے تاہم تصورِ جمال میں اسطور کی سی جھلک ملتی ہے جس سے ان کے ہاں رومانیت بدرجہ اتم محسوس کی جا سکتی ہے۔ محبوب کے سراپے کو جل پری سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جھیل کی دوسری طرف نیلے محل کے سامنے
آئی نظر وہ جل پری پھر میری آنکھ کھل گئی (۴)

مذکورہ بالا شعر میں شعری محاکات بھی خوب ہے۔ جھیل اور نیلے محل کا منظر قاری کو ایک پرکیف ماحول میں لیے چلتا ہے۔ ایک طرف کیف کے عالم میں محبوب کی مدح ملتی ہے تو دوسری طرف اس کی ستم ظریفی کا بھی گلہ ملتا ہے جو کلاسیکی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ محبوب ہمکلام نہیں تو بھی عاشق کی جان پہ بنی ہوئی ہے اور جو وہ کچھ کہے تو اس کا کلام عاشق کی ذات کو توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ یہ حال طارق ہاشمی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

پہلے تو اک سکوت نے توڑ کے رکھ دیا اسے
پھر تری لب کشائی سے اور بکھر گیا وہ شخص (۵)

طارق ہاشمی کی غزل کا یہی محب محبوب کی شیرینیِ لب کا حد درجہ متمنی ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن کلامِ یار سے متعلق ہے۔ جب جب کلام شیریں ہو تب تب دھڑکن رواں ہے۔ جونہی کلام میں تلخی آتی ہے، دھڑکن بے ربط ہو جاتی ہے، رکنے لگتی ہے، زیست کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے۔ جب تک محبوب کا اندازِ تخاطب مناسب و موزوں ہے تب تک عاشق کے لمحات زیست بھی خوب کٹتے ہیں لیکن جیسے ہی اس تکلم میں بدلاؤ آتا ہے، عاشق کا وقت مشکل ہوا چلا جاتا ہے۔ احوال ملاحظہ ہو:

نہیں کرتا ہے جب مجھ سے تکلم تو سہولت سے
تو سینے میں میرا دل بھی بصد مشکل دھڑکتا ہے(۶)

عشق کے موضوع کے بیان میں طارق ہاشمی نے کلاسیک کے تمام رنگوں سے اپنی غزل پینٹ کی ہے۔ان کی غزل کا ہیرو کلاسیکی غزل کے عشاق کا سا سودا سر میں رکھتا ہے اور اکثر اعتدال و تعمیم کی راہ چھوڑ کر جنون و انتہا پسندی کے ساتھ اپنی نظریہ عشق کی تخصیص کرتا ہے۔اس نظریے کے تحت رگوں کا لہو پانی کی مثل ہے کہ جب تک یہ عاشق کی آنکھ سے آنسو بن کے نہ بہے۔غالب نے اس سیال کو لہو ماننے سے انکار کر دیا تھا جو آنکھ سے نہ ٹپکے:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟(۷)

طارق ہاشمی بھی اس بارے غالب کے پیرو ٹھہرے۔وہ بھی اس جذبے کو محبت سے تعبیر نہیں کرتے جو عاشق کو خون رونے پہ مجبور نہ کر دے۔ان کے نزدیک وہ جذبہ محبت کا جذبہ ہرگز نہیں جو لہو نہ رلائے۔تف ہے ایسے عاشق پر اور خاک ہو اس پر کہ شدتِ جذب کے باعث جس کی آنکھیں خوناب نہ ہوں:

حیف آنکھوں سے کبھی خون نہیں ٹپکا طارق
خاک ہم پر کہ محبت بھی نہیں کر سکتے(۸)

کلاسیکی غزل میں عشق و اشک باہم و پیہم ملتے ہیں۔جب کوئی عشق کے جذبے کا اسیر ہوتا ہے، تارے اس کی مژگان کے رہین ہو جاتے ہیں۔عاشق کی آنکھوں سے نیر ندی مسلسل رواں رہتی ہے جس میں کبھی خوشی تو کبھی غم کے گوہرِ آبدار شامل ہوتے ہیں۔اس مضمون میں کوثر مظہری کا ایک شعر ہے:

پتلیوں پر رقص کرنا ہی کمال فن نہیں
درد کے آنسو کو تو پیہم روانی چاہئے(۹)

گویا آنکھ کا پانی اس وقت تک آنسو کہلانے کا حقدار نہیں کہ جب تک اس میں درد کی آمیزش نہ ہو۔ورنہ ہو تو آنسو پانی ہے اور جب آنسو درد کا بنا ہوا ہو تب اس کا پیہم جاری رہنا ہی اس کی بقا کی ضمانت ہے۔طارق ہاشمی کے ہاں یہ آنسو محبوب کی دینِ خاص ہے کہ جو مسلسل رواں بھی ہے اور مژگان کا مستقل ساکن بھی ہے۔احوالِ اشک ملاحظہ ہو:

بہت قرینے سے ملفوف ہے مژہ میں اشک
بہتی رہتی ہیں آنکھیں تیرے تحائف سے(۱۰)

کلاسیکی شاعری کا ایک اہم پہلو محبوب کے سامنے محب کی کم مائیگی کا اظہار ہے۔ کہیں کمتری کا یہ اظہار نیاز مندی ہے تو کہیں محبوب کی ذات کا ترفع محب پہ اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو محبوب کی ذات کے سامنے بالکل کم حیثیت تصور کرتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں یہ عاشق کا عجز ہے اور یہ عجز ہی کلاسیکی محبوب کا مقام بلند کرتا ہے۔ کلاسیکی طرز پہ ہی طارق ہاشمی کی غزل میں بھی یہ موضوع ملتا ہے کہ جو عاشق کے عجز اور معشوق کے ترفع کا اظہار ہے:

میں اس سے عشق تو کر بیٹھا ہوں مگر طارقؔ
یہ سلسلہ میری اوقات سے زیادہ ہے(۱۱)

چاند کلاسیکی شاعری کا اہم استعارہ ہے۔ کبھی یہ معشوق کی شکل میں ملتا ہے تو کبھی فرد کی تنہائی کی تجسیم کرتا ہے، کبھی رومان انگیز ماحول ساز گار کرتا ہے تو کبھی منتظر کے ساتھ محوِ انتظار رہتا ہے، کبھی تیرگیِ شب کا تدارک کرتا ہے تو کبھی مہجور عاشق کا ہمجولی بن جاتا ہے۔ ہجر زدگان کی آہوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کا ظرف رکھنے والا چاند طارق ہاشمی کی غزل کے عاشق کا دردِ فراق بھی خوب بٹاتا ہے:

شب ہجراں جو ترا درد جگاتا ہے مجھے
حال دل چاند کو میں چاند سناتا ہے مجھے(۱۲)

ہجر اور فراق کلاسیکی غزل کا ایک اہم احساس ہے۔ اول اول عشق وصلِ یار کو محور و مرکز رکھتا ہے لیکن عشق اپنی منتہا کو تب ہی پہنچتا ہے جب یہ ہجر اور فراق کے ذائقے سے آشنا ہوتا ہے۔ جب کوئی عاشق ہجر کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تب لاشعوری طور پر وہ کائنات کے ہر مظہر میں اپنی کیفیت تلاشتا ہے۔ چاند میں تنہائی اور بارش میں آنسو محسوس کرنا مہجور عاشق کا معمول بن جاتا ہے۔ طارق ہاشمی کی غزل کا فراق زدہ عاشق بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار نظر آتا ہے۔ لمحہِ ہجر کے وارد ہوتے ہی آسمان کا برسنا اور عاشق کی آنکھ کا برسنا ایک مثل ہو جاتا ہے:

ابر برسا تھا ٹوٹ کر طارقؔ
جب مجھے چھوڑ کر گیا کوئی(۱۳)

ہجر کا وار اس قدر کاری ہے کہ بھر بھر سندیسے بھیجے جاتے ہیں جو محبوب کے روبرو عاشق کا حال بیان ہو۔ یہ پیام بری کلاسیکی شاعری کا اہم رنگ ہے کہ جس میں مجرد اور غیر مجرد مظاہر کو پیغام رسانی کا فریضہ سونپا جاتا ہے۔ کبھی قاصد کو خط تھمایا جاتا ہے تو کبھی طائرِ پیام بری کا امر سرانجام دیتے نظر آتے ہیں۔ مدعا ہر صورت میں محبوب سے کلام ہے، احوال کی صورت

دریافت کرنا ہے۔ قاصد کا وجود عاشق کے جذبے کو مہمیز کیے رکھتا ہے اور یوں قاصد عشق کے کھیل کا ایک اہم کھلاڑی قرار پاتا ہے۔ حفیظ جالندھری کے ایک شعر میں عاشق کی قاصد سے بندھی آس اور امید کا احوال ملاحظہ کیجیے:

کسی امید پر زندہ رہوں یا گھٹ کے مر جاؤں
وہ کیا کہتے ہیں اے قاصد وہ کیا ارشاد کرتے ہیں (۱۴)

گویا زندگی اور موت کا دارومدار اب قاصد کے الفاظ پہ ہے کہ وہ کیا جواب لاتا ہے۔ طارق ہاشمی کی غزل کا عاشق بھی جب ہجر سے بے کل ہوتا ہے تو ہجر کی کیفیت کو ہوا کے سپرد کر کے اسے اذنِ سفر دیتا ہے کہ کسی صورت محبوب کو ہجر میں تڑپتے عاشق کی خبر پہنچے اور کیا معلوم کہ وہ اس تڑپ کی کچھ چارہ جوئی کرنے پہ مائل ہی ہو جائے۔ معلوم نہیں ہوا یہ پیام لے جا کے عاشق کے سپرد کرے تو اس کا کیا ردِ عمل ہو، یہ احساس تو بہر طور ہو گا کہ کم از کم محبوب کو بھی شریکِ کیفیت کر لیا گیا ہے۔ طارق ہاشمی کی غزل میں ہوا کے ہاتھوں نامہ بری کا احوال ملاحظہ ہو:

ہواؤ! اس کے نگر میں جانا تو اسے کہنا
بچھڑنے والے! تیری جدائی کا دکھ بہت ہے (۱۵)

مذکورہ بالا شعر میں ہجر کے دکھ کا نقش اس قدر گہرا ہے کہ زبان جیسے گنگ ہو گئی ہو اور بس چند الفاظ کہ جس سے ہجرت کی شدت مترشح ہو، عاشق کے کاسے میں بچے ہوئے ملتے ہیں۔ ہجر کے ساتھ ساتھ وصل بھی کلاسیکی شاعری کا نمایاں موضوع ہے۔ ہجر کا معکوس بیانیہ خواہشِ وصل اور وقوعِ وصل سے عبارت ہے۔ وصل وہ لطف ہے کہ جو ہجر کی زہر ایسی تلخی کا واحد تریاق ہے۔ طارق ہاشمی کی غزل کا عاشق بھی اس تریاق سے کماحقہ فیض اٹھاتا ہے اور زیست کی صورت گری مزید کرتا ہے۔ سب صدمے بھلا کر وصل کا لطف دیکھیے:

مل کر کسی سے دل کا خوشی سے وہ حال ہے
جیسے کبھی فراق کے صدمے نہیں سہے (۱۶)

رقیب کلاسیکی شاعری کا اہم کردار ہے۔ کبھی عاشق اور رقیب ہمنوا نظر آتے ہیں کہ دونوں معشوق کے ستم کا یکساں نشانہ بنتے ہیں۔ کبھی عاشق رقیب کو جلی کٹی سناتا ہے اور کبھی وہ رقیب کا شکست دے کر عشق کے میدان کا فاتح بن جاتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی بھولا بھٹکا رقیب عاشق کے مقابل آن نکلتا ہے لیکن معشوق کے پارہ صفت ہونے کے باوصف جلد ہی فرار ہو جاتا ہے۔ ایسے میں عاشق کا فخر و غرور واجب ہے کہ اس کا ظرف رقیب کی نسبت وسیع ثابت ہوتا ہے۔ طارق ہاشمی کی غزل میں اس خیال کی بندشِ الفاظ ملاحظہ ہو:

تمھارے چاہنے کی کس کو تاب کس کا ظرف

خوشا کہ عشق میں اپنا کوئی رقیب نہیں (۱۷)

متذکرہ بالا شعر میں طارق ہاشمی نے رقیب کی کم ظرفی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میر سوزؔ کے ہاں قریباً اسی طرز پہ رقیب کی ذات کی تحدید ملتی ہے کہ جس کے سبب معشوق تو کیا کوئی اور شخص بھی رقیب کی حب کا روادار نہیں:

جس کا تجھ سا رقیب ہووے گا
کون اس کا حبیب ہووے گا (۱۸)

عالمِ عشق میں جو نام مجنوں نے کمایا، کیا ہی کسی نے کمایا ہو گا۔ مجنوں کلاسیکی شاعری کے سچے اور کھرے عاشق کا پختہ استعارہ ہے۔ اس کی شوریدہ سری سے کئی کلاسیکی غزلوں کی دیواریں خون آشام ہیں۔ ہائے افسوس کہ پھر عالمِ عشق میں مجنوں کا سا عاشق پیدا نہ ہوا۔ عشق کے میدان کے سورماؤں کا چراغ مجنوں کے آگے کچھ نہیں جلتا۔ اچھے اچھے عاشق مجنوں کے آگے دم بھرتے نظر آتے ہیں۔ طارق ہاشمی کی غزل کا عاشق بھی مجنوں کے مقابل اپنی کم آزاری کا کھل کے اظہار کرتا ہے:

کاش تو دیکھتا مجنوں کا زمانہ طارقؔ
اب تو اس عشق کے آزار میں کچھ بھی نہیں ہے (۱۹)

گویا عشق کی معراج مجنوں کا سودا ہے جس کا متحمل مابعد مجنوں کسی عاشق کا سر نہیں۔ اسی مضمون کو کلاسیکی شاعر نوح ناروی اپنے الفاظ میں اس طرح باندھتے ہیں:

لیلیٰ ہے نہ مجنوں ہے نہ شیریں ہے نہ فرہاد
اب رہ گئے ہیں عاشق و معشوق میں ہم آپ (۲۰)

عشق کا سودا تو کلاسیکی غزل کے سر میں خوب سمایا ہی ہے تاہم عشق کی ایک معراج، ایک مقام یہ بھی ہے کہ جب عاشق ظاہر کو پانے کی تمنا نہیں رکھتا۔ یہ مقام، یہ کیفیت نایاب ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس مقام تک رسائی کا راستہ ظاہری مظاہر کو طے کرنے کا ہی ہو اور اس کے بعد ہی باطن تک رسائی کی صورت بنتی ہو، کچھ یہ حالات وواقعات اور تجرباتِ عشق پر بھی منحصر ہے کہ ہر عاشق جن سے مختلف صورتوں میں گزرتا ہے۔ جب عاشق ظاہر سے باطن کا سفر طے کر لیتا ہے تب اس کے لیے ظاہری وصل معنی کھو دیتا ہے اور وہ ظاہری ہجر سے متوحش نہیں ہوتا۔ غلام حسین ساجد کا ایک شعر دیکھیے:

عشق پر فائز ہوں اوروں کی طرح لیکن مجھے
وصل کا لپکا نہیں ہے ہجر سے وحشت نہیں (۲۱)

گویا عاشق اس مقام پہ ہے کہ جب ظاہری وجود مرکزِ عشق نہیں رہا بلکہ عاشق و معشوق کا ایک اور طرح کو تعلق بن چکا ہے۔ ایسا تعلق جس میں مومن کے شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (۲۲)

کے مصداق عاشق کے جہانِ عشق میں وقت اور وجود کی قید و بند ختم ہو جاتی ہے۔ ہر لمحہ وصل کا لمحہ ہے جو دنیا کی آنکھ سے بھلے ہجر کا ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ اس مقام پر بوالہوسی عشق کا شیوہ نہیں رہتی کہ یوں بھی یہ کچے عشق کی نشانی ہے، پختہ عشق کے تو اور ہی رنگ ہیں۔ ایسا ہی ایک رنگ طارق ہاشمی کی غزل میں ملاحظہ ہو:

خمیر اٹھا نہیں اپنا ہوس کی خاک سے طارقؔ
یہ دست عشق ہے جس کو ہم اپنی گل سمجھتے ہیں (۲۳)

یہیں پہ موقوف نہیں بلکہ طارق ہاشمی کا تصورِ عشق اس وقت کچھ عجب چھب دکھلاتا ہے کہ جب دسترس ہوتے ہوئے بھی عاشق کے ہاں انسانی تقاضے کی نفی ملتی ہے۔ یہاں قرینہ ہے کہ یا تو عاشق کے ہاں ظاہری وصل کی تمنا ہوتے ہوتے آخر دم توڑ چکی ہے یا پھر عشق جسمانی سطح پر دستیاب ہونے سے قبل ہی عاشق کے وجود میں اس طرح سرایت کر چکا ہے کہ اب کوئی دوئی محسوس نہیں ہوتی اور جب دوئی نہیں تو جسمانی تقاضا چہ معنی؟ احوال ملاحظہ ہو:

عجب یہ وصل کی شب ہے کہ طارقؔ
تقاضا کوئی جسمانی نہیں ہے (۲۴)

مجموعی طور پر دیکھیں تو طارق ہاشمی کی غزل کا غالب رنگ کلاسیکی غزل سے میل کھاتا ہے۔ جدید عہد کی افراتفری میں کہ جب فرد کا انتشار نظم ہوتا ہے، غزل کا یہ ٹھہراؤ اور دھیما پن قاری کو چونکا دیتا ہے۔ کہیں کہیں عشق کا جذبہ طارق ہاشمی کی غزل میں بھی سر پٹختا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن زیادہ تر مقامات پر یہ سپردگی، وارفتگی، عجز اور سکون سے عبارت ہے۔ عشق کی جولانیوں سے لے کر عشق کی معرفت تک کے مضامین طارق ہاشمی کی غزل میں خوب ملتے ہیں۔ وہ ادبی ماحول جس میں طارق ہاشمی کی شخصیت کی آبیاری ہوئی، ان کی غزل کو بھی تر و تازہ و توانا رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ دورِ حاضر کے ادبی افق پر غزل کا ایک تارہ طارق ہاشمی کے نام سے یوں چمکتا ہے کہ جو ادب کے در و بام کو منور کرنے کی پوری تاب رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، دستک دیا دل، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص: ۹۷
۲۔ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، دل دسواں سیارہ ہے، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۲ء، ص: ۳۱
۳۔ شاہ اکبر داناپوری، جذباتِ اکبر، آگرہ اخبار پریس، آگرہ، ۱۹۱۵ء، ص: ۱۳۶
۴۔ طارق ہاشمی، دل دسواں سیارہ ہے ص: ۴۵
۵۔ ایضاً، ص: ۸۹
۶۔ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، دستک دیا دل، ص: ۶۸
۷۔ غالب، دیوان جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ (مرتبہ مفتی انوار الحق)، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، ۱۹۲۱ء، ص: ۴۰۶
۸۔ طارق ہاشمی، دل دسواں سیارہ ہے، ص: ۴۰
۹۔ کوثر مظہری، ماضی کا آئندہ، مظہر پبلی کیشنز، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۰
۱۰۔ طارق ہاشمی، دستک دیا دل، ص: ۲۹
۱۱۔ ایضاً، ص: ۲۸
۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۳۸
۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۱۲
۱۴۔ حفیظ جالندھری، کلیات حفیظ جالندھری (مرتبہ خواجہ محمد زکریا)، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۶۲
۱۵۔ طارق ہاشمی، دل دسواں سیارہ ہے، ص: ۲۹
۱۶۔ ایضاً، ص: ۲۸
۱۷۔ ایضاً، ص: ۹۱
۱۸۔ https://www.rekhta.org/ghazals/jis-kaa-tujh-saa-habiib-hovegaa-meer-soz-ghazals?lang=ur
۱۹۔ طارق ہاشمی، دستک دیا دل، ص: ۱۱۹
۲۰۔ نوح ناروی، انتخاب سخن: جلد دوم، (مولف: حسرت موہانی)، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۴۰
۲۱۔ https://www.rekhta.org/couplets/ishq-par-faaez-huun-auron-kii-tarah-lekin-mujhe-ghulam-husain-sajid-couplets?lang=ur

۲۲۔ https://www.rekhta.org/couplets/tum-mire-paas-hote-ho-goyaa-momin-khan-momin-couplets?lang=ur

۲۳۔ طارق ہاشمی،ڈاکٹر،دستک دیا دل،ص:۵۴

۲۴۔ طارق ہاشمی،دل دسواں سیارہ ہے،ص:۶۴